بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

انگلو امریکن بلاک کی روایتی اسلام دشمنی اور روس کی بروقت غداری سے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو زبردست نقصان ہوا ہے، اس کی داستان اتنی دلفگار اور المناک ہے کہ الفاظ اُسے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلام دشمن طاقتیں برسوں سے اپنے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف ناپاک عزائم پال رہی تھیں اور اس غرض سے وہ بڑی دیر سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت ایسے حالات پیدا کر رہی تھیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں اسلام اور مسلمان یکسر نیست و نابود ہو جائیں۔ چنانچہ یہ جو کچھ ہوا ہے اسے کسی وقتی اور اتفاقی حادثے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت عمل میں لایا گیا۔

مغرب کے نصاریٰ صلیبی جنگوں ہی سے اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں ایک شدید نفرت رکھتے چلے آ رہے تھے اور انہیں مسلمان فاتحین، خصوصاً سلطان نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں جو شکستیں کھانا پڑی تھیں اُن کا انتقام لینے کے لیے مناسب مواقع کی تلاش میں تھے۔ جب تک مسلمان دنیا کی ایک ناقابلِ تسخیر قوت رہے اس وقت تک تو یہ لوگ دبک کر بیٹھے رہے لیکن جونہی وہ زوال کے شکار ہوئے ان اسلام دشمن طاقتوں نے ان کو زک پہنچانے، انہیں تباہ و برباد کرنے اور انہیں دنیا سے مٹانے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

جنگِ عظیم اوّل سے پہلے شمالی عرب پر عثمانی حکومت کا قبضہ تھا۔ شام، عراق، لبنان اور

فلسطین ترکی کے ماتحت تھے۔ برطانیہ نے سب سے پہلے تو عربوں اور عثمانیوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکائی اور خود عربوں کا مونس اور غمخوار بن کر انہیں عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ پھر جنگ میں جب جرمنی کو شکست ہوئی اور ترکی جو اس کا ہمنوا تھا اُس کی کمر بھی ٹوٹ گئی تو برطانیہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنتِ عثمانی کے حصّے بخرے کر دیئے۔

برطانیہ کی نظر جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے یہودیوں کے مال پر لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اُن سے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے انہیں اس امر کا یقین دلایا کہ وہ اگر جنگ میں برطانیہ کی بھرپور امداد کریں تو وہ انہیں ایک الگ خطۂ ارضی کے حصول میں مدد دیگا۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر جب ترک پورے عرب سے نکل گئے اور فلسطین ایک برطانوی نوآبادی کی طرح برطانیہ کے زیر نگیں ہو گیا تو وہاں ایک صہیونی ریاست کے قیام کے منصوبے بننے لگے اور یہودی تمام ممالک سے آ کر اس خطّے میں آباد ہونے لگے۔ مگر عربوں کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے ان کی کوئی ریاست قائم نہ ہو سکی۔

دوسری جنگِ عظیم نے حالات کا رُخ بالکل بدل دیا۔ یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کی داستانیں سنا سنا کر ایک طرف تو جرمنی کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت اُبھارا گیا اور دوسری طرف یہودیوں کی مظلومیت کا چرچا کر کے اُن کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کے لیے فضا ہموار کی جانے لگی۔ ۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ نے فلسطین سے حتمی دستبرداری کے بعد اُسے اقوام متحدہ کے حوالہ کر دیا تو جنرل اسمبلی نے صرف دس ہفتوں کے اندر یہ سرزمین عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ عربوں نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن مغربی طاقتیں چونکہ اس خنجر کو مسلمانوں کے سینے میں پیوست رکھنے پر مُصر تھیں اس لیے آخر کار مئی ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ایک بڑے حصّے پر یہودی ریاست قائم کر دی گئی۔ عربوں نے تلوار کے زور سے اس غاصبانہ تسلط کو روکنے کی کوشش کی اور آٹھ مہینے تک اس کے خلاف برسرِ پیکار رہے، مگر مغربی طاقتوں نے یہودیوں کو روپے اور ہتھیاروں سے اتنی مدد دی کہ عربوں کی اُن کے

سامنے کچھ پیش نہ جا سکی اور وہ فلسطین کے آٹھ ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہو گئے۔

یہودی غاصبوں کا مقصد اس جنگ سے صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ ملک پر قبضہ کریں، بلکہ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے مقبوضہ علاقے سے عربوں کو نکال باہر کریں اور ان کی جگہ یہودیوں کو لا کر آباد کریں۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کے ساتھ ٹھیک وہی کچھ کیا جو نازیوں نے تین چار برس پہلے خود ان کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے عربوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، کسی پر رحم نہ کھایا۔ اور دس لاکھ فلسطینیوں کو، جو صدیوں سے اس علاقے میں آباد تھے، سخت ظلم و ستم کے ساتھ جلاوطن کر دیا۔ مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ جو اہلِ مغرب یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کا دنیا بھر میں ماتم کر رہے تھے، وہ عربوں پر یہودیوں کے بالکل وہی مظالم دیکھ کر ذرا ٹس سے مس نہ ہوتے، بلکہ الٹے ان کی بہادری پر داد دینے لگے۔ انہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ احساس نہ ہوا کہ دس لاکھ عرب اسی بدبخت اسرائیل کی وجہ سے گذشتہ انیس سال سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان کے گھر بار تباہ ہوئے۔ اُن کی عزتیں لٹیں، ان کی زمینیں غصب ہوئیں، مگر جانسن، ولسن یا ان کے پیش روؤں میں سے کسی ایک کے دل میں بھی انسانی ہمدردی کی کوئی لہر نہ اٹھی۔ ان حق ناشناسوں کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ دس لاکھ عرب بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

پھر مغربی قوموں کا یہودیوں کے بارے میں احساسِ مروت و ہمدردی بھی بڑا عجیب ہے کہ ان کی حالتِ زار پر ترس کھاتے ہوئے انہیں خود اپنے وسیع و عریض مقبوضات میں تو ایک انچ زمین بھی نہ دی مگر انہیں ایک دوسری قوم پر لا کر مسلط کر دیا تاکہ وہ اسے گھر سے بے گھر کر کے اس کی جگہ خود بس جائیں۔ اُن کی نگاہ میں فلسطین بائیبل کی سرزمین ہے اور وہ اسے تاریخی طور پر یہودیوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس سرزمین سے یہودیوں کا آخری اخراج دو ہزار سال پیشتر رومیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس وقت سے عرب یہاں آباد رہے۔ چودہ سو سال پہلے جب مسلمان

فلسطین پہنچے تو یہود کا یہاں نشان تک موجود نہ تھا۔ لیکن مغرب کی سامراجی قوتوں کو چونکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید پرخاش ہے اور انہیں صرف انہیں مٹانا مقصود ہے اس لیے انہوں نے اس خنجر کو مشرقِ وسطیٰ کے قلب میں پیوست کر کے چھوڑا اور اب حق و انصاف کے ہر تقاضے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے وہ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

مغربی سامراج نے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے برباد کرنے کے وسیع پروگرام کا ایک ضروری حصہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اہلِ مغرب نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب ان کے لیے مشرقی ممالک اور خاص طور پر مسلمان ممالک کو براہِ راست اپنی غلامی میں رکھنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ انہیں نئی اُبھرنے والی طاقتوں کی طرف سے جو خطرات پیش آسکتے تھے اُن کی نوعیت کا بھی ان کو اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب کبھی مسلمانوں کو اسلام کے نام پر پکارا جاتا ہے وہ فوراً سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اس نام ہی سے ان کے اندر اتفاق و اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے بھی انہیں صرف اسلام ہی نے بیدار کیا اور قوت فراہم کی۔ ان سارے خطرات کو پوری طرح بھانپتے ہوئے مغربی سامراج نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جو مندرجۂ ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

• مشرقِ وسطیٰ میں، جو دنیائے اسلام کے لیے قلب کی حیثیت رکھتا ہے، اسرائیل کا سرطان پیدا کر دیا جائے۔ مغربی طاقتوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسرائیل اپنے وجود کے لیے ہمیشہ ان کا دست نگر رہے گا اور اس طرح اسرائیل کی حمایت کی آڑ میں ان سامراجی طاقتوں کو مشرقِ وسطیٰ کے مسائل میں براہِ راست دخیل ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔

• کسی نہ کسی طرح اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے نظریۂ حیات کو خود مسلمان ملکوں کے اندر پروان چڑھایا جائے اور اس مقصد کے لیے مغربی الحاد اور اشتراکیت دونوں کو مسلط کرنے کا انتظام کیا جائے۔ جن لوگوں کو مغربی الحاد سے دلچسپی ہو اور وہ امریکہ برطانیہ

اور فرانس کی طرح مذہب سے بیگانہ ہو کر اباحیت کی زندگی بسر کرنے میں دلکشی محسوس کرتے ہوں اُن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی اسی غرض کے لیے کام کر رہی ہے۔ لیکن جو لوگ برطانیہ اور امریکہ کے مظالم کی وجہ سے براہ راست ان کے اثر میں نہ آسکیں اُن کے لیے اشتراکیت کے نسخہ کو آزمایا جائے۔ ان قوموں کا مقصد صرف ایک ہے کہ یہاں کسی طرح اسلام ختم ہو خواہ یہ کام مغربی الحاد کے ذریعہ سے انجام پائے یا اشتراکیت کے ذریعہ سے ——— اسلام کے معاملے میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس سب پوری طرح متفق ہیں۔ ایک امریکی اور ایک برطانوی اشتراکیت کو تو گوارا کر سکتا ہے مگر اسلام کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک اشتراکی کے لیے سرمایہ دارانہ الحاد تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے مگر خدا پرستانہ اسلام کو وہ پنپتے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ مغربی طاقتوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسلام کے ختم ہو جانے کے بعد پھر یہ مسلم حکومتیں خواہ اشتراکیت کی علمبردار بنیں یا سرمایہ داری کی، لیکن ان میں زندگی کی حرارت اور حرکت بالکل ختم ہو جائے گی۔ اس بنا پر وہ مغرب کے لیے کسی خطرے کا موجب نہ رہیں گی۔

● ان ممالک میں رائے عام کو کبھی پروان نہ چڑھنے دیا جائے بلکہ سخت گیر آمروں کو عوام کا ہیرو بنا کر ان کی گردنوں پر مسلط کیا جائے اور انہیں اس بات کی شہ دی جائے کہ وہ عوام کے منشا اور مرضی کے خلاف زبردستی اُن پر مغربی الحاد ٹھونسیں یا اشتراکیت۔ چونکہ اشتراکیت سرمایہ داری کی نسبت ابھی زیادہ انقلاب انگیز قوت ہے اس لیے جو لوگ سوشلزم کا نعرہ بلند کریں اُن کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی جائے۔

● دنیائے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے مسلم ریاستوں میں قومیت پرستی کی تحریک کو ابھارا جائے۔

● مسلمان ممالک کو معاشی اعتبار سے اس قدر مفلوج کر دیا جائے کہ اپنے وسائل کے بل بوتے پر نہ تو انہیں جینے کی ہمت ہو سکے اور نہ ایسا کرنے کے انہیں ڈھنگ ہی آئیں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں مشرقِ وسطیٰ کی اس کشمکش کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کشمکش کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان ممالک مغرب کے ان ناپاک عزائم کو اچھی طرح سمجھتے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتے۔ لیکن افسوس کہ جس دام میں انہیں مغرب کے شکاری لانا چاہتے تھے وہ ہنسی خوشی اس میں آ گئے اور سارے وہ کام کیے جو انہیں اپنی تعمیر و ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آدمی دنیا میں ہر چیز کا سامنا کر لیتا ہے مگر حقیقت، آئینہ اور ضمیر کا سامنا نہیں کر سکتا۔ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنا جائزہ یا اپنا احتساب ہے۔ گریبان میں منہ ڈالنا کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں بلکہ یہ ایک بڑی ہی دشوار اور کٹھن منزل ہے جس سے بڑے بڑے لوگ کانپ اٹھتے ہیں۔ انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں اور بربادیوں کو دوسرے کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہونا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خارجی عوامل کسی فرد یا قوم کو کبھی اوقات شدید نقصان پہنچا دیتے ہیں لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ عوامل اُسی صورت میں زیادہ مؤثر ہوتے ہیں جب داخلی کمزوریوں نے کسی فرد یا قوم کے قویٰ کو بالکل مضمحل کر دیا ہو۔ یہی بات مشرقِ وسطیٰ کی اس بربادی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ نے بلاشبہ حق و انصاف کا خون کیا ہے، روس نے بلاریب عین وقت پر غداری کی ہے، اسرائیل نے یقیناً بڑی سفاکی اور درندگی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن کیا یہ مسلمان ممالک اپنے ضمیر کے سامنے اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس بربادی میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں اور یہ سراسر غیروں کی زیادتیوں اور ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ ہے؟ بیرونی سازشیں کسی فرد یا قوم کا بال تک بیکا نہیں کر سکتیں اگر اُس کے داخلی حالات اُن سازشوں کے لیے سازگار نہ ہوں۔

اِس بربادی پر جس قدر تبصرے بھی دیکھنے میں آئے ہیں اُن میں شاہ مراکش کا تبصرہ ہمیں سب سے زیادہ صحیح، مناسب اور حقیقت افروز معلوم ہوا ہے جس میں انہوں نے کھل کر کہا ہے کہ:

"عربوں کو مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں اپنے نفاق، غلط کاریوں اور گناہوں کے باعث شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ خدا نے ہمیں ہمارے اعمالِ بد کی سزا دی ہے اور ہمیں خبردار کیا ہے کہ اگر ہم آپس

میں متحد نہ ہوتے اور ایک دوسرے کی تذلیل سے باز نہ آئے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی و بربادی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ چونکہ ہم میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اس لیے ہمیں دشمن کے مقابلے میں ناکامی ہوئی۔ ارشاد خداوندی یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اُچھالیں۔ لیکن اس کے برعکس ہم زبان اور تحریر کے ذریعے بارہا ایک دوسرے کی توہین کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ارشادِ ربانی یہ تھا کہ ہم اس کے فرمانوں سے روگردان نہ ہوں اور اپنا ضابطہ حیات اس کی ہدایات کے مطابق مرتب کریں مگر ہم نے خدا کے اس حکم کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ ہم اللہ سے اپنے رشتے توڑ چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بھی ہم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے۔"

قرآن و سنت کے مطالعہ اور گذشتہ اقوام کے حالات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں قوموں کی عزت و سربلندی اور ذلت و رسوائی کے کچھ اصول ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا اصول یہ ہے کہ غیور اور قادرِ مطلق ذات نے جب چاہا انتہائی کمزور اور بے سہارا لوگوں سے اپنے دین کی خدمت کا کام لے لیا۔ لیکن اُس نے اپنے نام لیواؤں کو کبھی بھی دین کا باغی بن کر دنیا میں پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ جن قوموں نے اس کے دین سے یکسر انحراف کر کے اپنی زندگی کی تعمیر خالص کفر و انکار کی بنیادوں پر کی اُن کے لیے تو اس کی سنت یہ ہے کہ دنیا کی جو قوم بھی مادی اسباب کی فراہمی، حالات کے مطالعہ میں تدبر و تفکر اور افراد کے مابین اتفاق و اتحاد اور ضبط و نظم میں دوسروں پر جس قدر سبقت لے جاتی ہے وہ ان قوموں پر غالب آجاتی ہے جو کفر میں کیسی ہوں مگر ان صفات میں اس سے کم تر ہوں۔ البتہ وہ قومیں جو اس کے دین کی سچے دل سے مطیع و پیرو اور خادم و علمبردار ہوں اُن کے لیے اس کا خاص ضابطہ یہ ہے کہ مادی اسباب و وسائل کی کمی کا تدارک وہ بسا اوقات اپنی تائیدِ خاص سے کر دیتا ہے اور بے سروسامانی کے باوجود انہیں دین کے دشمنوں پر فتح عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ اُس نے اپنے نام پر کبھی دنیا میں کھوٹے سکوں کو چلنے نہیں دیا ہے۔ کوئی قوم مسلمان ہونے کے باوجود نہ اسلام کی پیروی

کرے، نہ اسلام کے لیے کام کرے، اور پھر مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے بھی ہر طرح کفار کے مقابلہ میں ہیٹی رہے، تو آخر اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اسے اپنی تائید خاص سے نوازے؟

ہم جب ان دونوں اصولوں کے تحت مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارے لیے ان دردانگیز حالات کو دُہرانا بہرحال کوئی خوشگوار کام نہیں ہے۔ یہ اپنے ہی زخموں کے ٹانکے کھولنا ہے۔ مگر انہیں بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہماری قوم حقائق کو پہچان سکے اور اُس سے جو کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اُن کی اصلاح کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرے۔ اُس فوج کے جیتنے کے کوئی امکانات نہیں ہوتے جو میدانِ جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد اپنے مورچوں، اپنے اسلحہ اور اپنی جنگی مہارت کا جائزہ لے کر ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ان کے ذکر پر اُلٹا بُرا ماننے لگے۔

ہم سب سے پہلے دینی نقطۂ نظر سے ان ممالک کے حالات پر غور کرتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے سارے ممالک میں اس وقت سب سے زیادہ طاقتور مصر ہے لیکن اس بدنصیب ملک کے فرمانروا نے گزشتہ چند سالوں سے اسلام کا حلیہ بگاڑنے اور اس کی جگہ غیر اسلامی تہذیب کو فروغ دینے اور غیر اسلامی نظریات کو باہر سے لاکر ایک مسلم معاشرے پر مسلط کرنے کے لیے جو ظلم و زیادتی کی ہے، پوری دنیا اس کی شاہد ہے۔ اس شخص نے ہر وہ کام کیا جو خدا کی رحمت کو دعوت دینے کے بجائے اُس کے غضب کو انگیخت کرنے والا تھا۔ اُس نے اسلام کے وسیع اور ہمہ گیر رشتۂ اخوت کو توڑ کر عرب قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ قرآن حکیم نے ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ وللہ العزۃ ولرسولہ لیکن اس شخص نے رسول کی جگہ عرب قومیت کو دے دی اور یہ کہنا شروع کیا العزۃ للہ و للقومیۃ العربیۃ۔ بعض جگہ تو باری تعالیٰ کو بھی نظر انداز کر کے پوری قوم کو صرف عرب

قومیت کا بُت پُوجنے کی تلقین کی۔ خدا اور اُس کے رسُول سے بغاوت میں وہ اور اس کے اعوان اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے مابین تصادم کے دنوں میں بھی ان لوگوں کے جو بیانات، خطبات اور تقاریر ریڈیو پر نشر کی جاتی تھیں ان میں خدا اور رسول یا دین اسلام کا نام تک نہ آتا تھا۔ عرب قومیت، عرب وطنیت، عرب افواج اور ملکی وسائل ہی کا وظیفہ بار بار پڑھا جاتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک خطبہ کا افتتاحی جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ باسم القومیۃ العربیہ اور باسم الکرامۃ العربیہ تھا۔

اب جبکہ مصر اور تمام مشرقِ وسطیٰ نے اس جنگ میں زبردست زک اٹھائی ہے، پھر بھی اس شخص کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ اس نے اس سانحہ کے بعد اپنا استعفاء پیش کرتے ہوئے جو پہلی تقریر نشر کی ہے اُس میں بھی عرب قوم پرستی کا بار بار تذکرہ ہے۔ اور جن باتوں کی طرف اُس نے قوم کی توجہ دلائی ہے ان میں سب سے اہم تین باتیں ہیں۔

- عرب مفادات اور عربوں کے حقوق کا تحفظ ہمارا نصب العین ہے۔
- عرب اتحاد کی توقع اس وقت بھی مثل شمع فروزاں رہے گی جب جمال عبدالناصر یہاں نہ ہوگا۔
- عرب سوشلزم بدستور برقرار رہے گا۔

یہ عرب قوم پرستی اور عرب سوشلزم کی تحریک درحقیقت اسلام کی بیخ کنی ہے قطع نظر اس سے کہ یہ بیخ کنی بجائے خود ان کی مقصود ہو یا نہ ہو، اس کا نتیجہ بہرحال یہ ہے کہ عربوں کا دینی رشتہ دنیائے اسلام سے کٹ جاتے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم دین محمدؐ کے بجائے دین مارکس کی پیرو بن جائے۔ ناصر صاحب نے کئی مرتبہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں علانیہ یہ کہا ہے کہ وہ عرب ریاستوں کو اشتراکی ریاستیں بنانے کا عزم بالجزم کر چکے ہیں۔ اس کے لیے زمین ہموار کرنے کی غرض سے انہوں نے لوگوں کے

دینی احساسات کو کچلنے میں کبھی دریغ نہیں کیا اور اُن تمام عناصر کا قلع قمع کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیا جن کی وجہ سے ان احساسات کے زندہ رہنے کے امکانات موجود تھے۔

اس ضمن میں ناصر صاحب کے بعض کام تو ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً فراعنہ کے لاتعداد بُت بنوا کر انہیں اہم مقامات پر نصب کرنا۔ نوٹوں اور ٹکٹوں پر فراعنہ کی تصویریں چھاپنا۔ نحن ابناء الفراعنہ کا نعرہ لگانا۔ گزشتہ سال جب مصر کے مالی حالات کی رپورٹ دنیا کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تو اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا تھا کہ مصری دولت کا ایک معقول حصّہ فراعنہ کے بتوں کی نذر ہو رہا ہے۔ آپ مصر کے کسی دفتر میں چلے جائیے۔ آپ کو فرعون رعمیس کی تصویر صدر ناصر کی تصویر کے پہلو میں آویزاں نظر آئے گی۔ اور یہ فرعون رعمیس وہی ہے جسے خود مصری مورخین بھی مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دینے کا حکم اسی نے دیا تھا جس کی مذمت قرآن مجید میں وارد ہوئی ہے۔

مصر کے مدارس کے لیے جو نیا نصاب مرتب کیا گیا ہے اُس میں نوخیز نسلوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو اسلام کے مطابق بنانے کے بجائے انہیں مغرب کے ملحدانہ نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئی ہیں۔ قلب و نگاہ کی یہ تبدیلی صرف مغربی طرز کے مدارس تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے مسموم اثرات اُن تعلیمی مراکز میں بھی پوری طرح نمایاں ہونے لگے ہیں جو کبھی دینی تعلیم کے گہوارے تھے اور جہاں نوجوان تعلیم و تربیت حاصل کر کے دین کے مبلغ اور معلم اور خطیب و واعظ بنتے تھے۔ مصر کی سب سے قدیم یونیورسٹی جامعۂ ازہر تک کے نصاب میں اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ کام کبھی دین سے کوئی معمولی تعلق رکھنے والا بھی کر سکتا ہے۔ جو لوگ اب یہاں سے تحصیل علم کر کے نکلتے ہیں انہیں اپنے مسلمان ہونے پر ناز کرنے کے بجائے فراعنہ کی اولاد

ہونے پر فخر ہوتا ہے اور وہ بڑے طمطراق سے کہتے ہیں "نحن ابناء فرعون"۔

پھر اس خطّہ کی سب سے بڑی دینی تحریک، جسے ہم مشرقِ وسطیٰ کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ سمجھتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں کہ یہ محض ایک تحریک نہ تھی بلکہ عرب ملکوں کے لیے اللہ کی رحمت تھی جس سے باری تعالیٰ نے اس خطے کو نوازا تھا، اس کا جو حشر ناصر صاحب کے ہاتھوں ہوا وہ ہمارے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا دینی المیہ ہے۔ اس تحریک کے جاں نثاروں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اُس کی یاد سے آج بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ کیا کوئی حکمراں اپنی بے بس رعایا پر کبھی اس قسم کے مظالم بھی ڈھا سکتا ہے۔ لیکن ناصر صاحب نے اشتراکیت کی اندھی محبت میں آنکھیں بند کر کے اس زبردست اسلامی تحریک کو بڑے جبر و استبداد کے ساتھ برباد کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مصر میں بلکہ دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی گروہ ایسا باقی نہ رہا جو اس جنگ کے موقع پر اپنی قوم میں دینی جذبہ و جوش اُبھارتا اور روحِ جہاد بیدار کرتا۔ غضب یہ ہے کہ نہ جنگ سے پہلے اخوان کو رہا کیا گیا، نہ جنگ کے زمانے میں، اور نہ جنگ کے بعد۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی ناصر صاحب کے کسی فعل کو شاید ہی دانشمندانہ کہا جا سکتا ہو۔ اس شخص کے دل میں صرف ایک ہی امنگ تھی کہ کسی طرح پُورے مشرقِ وسطیٰ میں اُسے بلاشرکتِ غیرے قیادت کا مقام حاصل ہو اور تمام عرب ریاستیں اس کی تابع فرمان ہوں۔ اس شخص نے کبھی اپنے بھلے اور بُرے میں تمیز کرنا نہیں سیکھا۔ اپنے دوستوں کو پہچاننے اور اپنے دشمنوں سے محتاط رہنے میں یہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عرب دنیا کے باہر مسلمان ممالک کی مخالفت کی اور اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ مثلاً دیکھیے۔ اس نے قبرص میں ترکوں کی حمایت کرنے کے بجائے ظالم مکاریوس کی صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ عملی تائید بھی کی۔ حالانکہ خالص نسلی اور مذہبی تعصب کی بنا پر وہ مسلمان ترکوں پر بدترین مظالم ڈھا رہا تھا۔ تاہم

ترکوں کے متعلق وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عربوں کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے لیکن پاکستان، جس نے اپنے قیام کے بعد سے آج تک ہمیشہ ہر عربی قضیے میں سب سے آگے بڑھ کر عربوں کی حمایت و وکالت کی ہے، اور جس کا خود عربوں نے بارہا اعتراف کیا ہے، اس کے مقابلے میں بھی اس شخص نے ہمیشہ بھارت کو ترجیح دی اور کشمیر کے مسئلہ میں، جس میں پاکستان سراسر حق پر ہے، کبھی ہندوستان کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ کوئی شخص اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک کلمہ بھی پیش نہیں کر سکتا جو اس نے کشمیریوں کی آزادی کے حق میں کبھی کہا ہو۔ پھر عرب لیڈروں اور فرمانرواؤں میں سے بھی جس کسی نے اس سے ذرہ برابر اختلاف کیا اُس کے لیے اس کی زبان سے اور اس کے ریڈیو اور پریس سے گالیوں کے سوا اور کوئی چیز کبھی سننے میں نہ آئی۔ موجودہ بحران سے ایک روز پہلے تک اس کی طرف سے سعودی عرب، اردن، اور تونس کو بُرا بھلا کہا جاتا رہا۔ سعودی عرب کے حکمران کو ابو ذقنہ (ڈاڑھی والا)، تونس کے سربراہ کو ابن الیہودیہ (یہودی عورت کا بچہ) اور اُردن کے فرمانروا کو سلالۃ الشیطان (شیطان کی اولاد) کے القاب سے نوازا جاتا رہا۔

پھر اس شخص نے روسی امداد کے بل بوتے پر ۱۹۶۳ء سے یمن پر چڑھائی کر رکھی ہے اور وہاں چار سال سے ۵۰-۶۰ ہزار مصری فوج خود اپنے عرب (مسلمان) بھائیوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ اس جنگ میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں عرب (مسلمان)، مارے گئے ہیں اور دولت کا جو ضیاع ہوا ہے اس کا اندازہ کروڑوں نہیں بلکہ اربوں پونڈ تک پہنچ گیا ہے۔ مسلسل چار سال کی اس جنگ نے مصر اور یمن کی معیشت بالکل تباہ کر دی، جزیرۃ العرب کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا، مصر کی فوجی طاقت کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اس میں اسرائیل سے ٹکر لینے کی سکت نہ رہی، اور غضب یہ ہے کہ اسرائیل کے حملہ کے وقت تک ۵۰ ہزار مصری فوج یمن میں پڑی رہی۔ اپنی اس حماقت کے لیے کوئی دلیلِ جواز نہ ناصر صاحب پیش کر سکتے ہیں نہ وہ لوگ جو ان کے حامی بنے پھرتے ہیں۔ یہ اسی یمنی مہم کا نتیجہ ہے کہ مصر کو روس اور اُس کے ہم خیال ملکوں سے بے تحاشا امداد لینی پڑی، اور ان کا اتنا زیرِ بار احسان ہو گیا کہ اسرائیل سے جنگ کے موقع پر روس نے جو بے وفائی کی اس پر ناصر صاحب حرفِ شکایت بھی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس وقت مصر کی معاشی حالت یہ ہے کہ

اس کی روئی اور سویٹر کی پوری آمدنی روس کے ہاتھ میں رہن ہے۔

مصر کے بعد مشرقِ وسطیٰ کا دوسرا طاقتور ملک شام ہے۔ اس بدنصیب ملک پر اس وقت بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ یہ پارٹی ۱۹۶۳ء سے تمام دوسری پارٹیوں کو ختم کر کے شام کی عنانِ اختیار سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بھی قومیتِ عربیہ اور اشتراکیت کی علمبردار ہے۔ اس پارٹی کو ابتداءً چار قسم کے عناصر وجود میں لائے تھے۔ عیسائی عرب۔ ملحدانہ رجحانات رکھنے والے مسلمان دروزی۔ اور علوی۔ اسلام کی مخالفت میں یہ چاروں متفق تھے۔ اوّل اوّل انہوں نے اُن ملحدین کو آگے رکھا جو اہلِ سنت سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً امین الحافظ اور صلاح بیطار جیسے لوگ۔ پھر دروزیوں اور علویوں نے ان کو بھی نکال باہر کیا اور یہ دونوں مل کر ملک پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد خود ان دونوں میں بھی چل گئی اور علویوں نے دروزیوں کو (جن کا لیڈر سلیم حاطوم تھا) حکومت سے بے دخل کر دیا۔ اس وقت ملک تنہا علوی فرقے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ علوی اور دروزی وہی فرقے ہیں جو اسلامی تاریخ میں نُصَیریہ اور قرامطہ کے نام سے معروف ہیں۔ اب نُصَیریہ کو علوی کہا جانے لگا ہے اور قرامطہ کے بقایا پر دروزی کے نام کا اطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ فوج اور نظم و نسق پر اس وقت علویوں کا قبضہ ہے اس لیے شام کی عام مسلمان آبادی ان کے ہاتھ میں بے بس ہے۔ الحاد اور اشتراکیت کو زبردستی اس پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی ہر مزاحمت کو توپ و تفنگ کی طاقت سے دبایا جاتا ہے۔

اس محدود سی اقلیت کو حکمرانی کرنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کوئی بیرونی قوت اس کی پشت پناہی کرے۔ روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور دست اعانت بڑھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک شام اشتراکیت کی گود میں چلا گیا۔ اس پارٹی نے ۱۹۶۵ء میں دمشق کی تاریخی مسجد جامع اموی پر گولہ باری کی۔ حمص اور حماہ کی

مسجدوں میں گھس کر نمازیوں پر فائرنگ کی۔ بکثرت مسلمان علماء اور لیڈروں اور با اثر لوگوں کو قید کیا جا چکا ہے، ان کی جائدادیں ضبط کی گئی ہیں اور بہت سے لوگوں کو ملک چھوڑ کر نکل جانا پڑا ہے۔ یہ سلسلہ موجودہ جنگ کے آغاز تک چلتا رہا ہے۔ اب جنگ کے بعد امین الحافظ اور اس کے بعثی ساتھیوں کو تو چھوڑ دیا گیا ہے لیکن جو علماء اور دوسرے مسلمان جیلوں میں تھے ان کی رہائی کی کوئی خبر دنیا نے اب بھی نہیں سنی ہے۔

یہ بعث پارٹی اسلام کے بارے میں کیا احساسات اور خیالات رکھتی ہے اس کا اندازہ اس کے سرکاری ترجمان "جیش الشعب" (قومی فوج) کے ایک مضمون سے لگایا جا سکتا ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں:

"اسلام اور مسیحیت کی قدروں نے عرب انسان کو ذلیل اور توکل پرست بنا دیا جو صرف یہ کہنا جانتا ہے کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیل نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند انقلاب پرست اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا، دین، سرمایہ داری، جاگیرداری، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر چھائی ہوئی ہیں محض حنوط شدہ پتلے ہیں جنہیں تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بنا دینا چاہیے۔ ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو، ذلیل اور عاجز بنکر رکوع میں جھکا رہتا ہو، اپنے لیے رحم اور مغفرت کی دعائیں کرتا ہو۔ ... ہم جس انسان کے ضرورتمند ہیں وہ اشتراکی اور انقلاب پسند انسان ہے جو انسان کو حقیقت مطلقہ سمجھتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو۔"

یہ مضمون ٹھیک اس زمانے میں شائع کیا گیا جب اسرائیل کا طوفان عرب ممالک کے سر پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تلا کھڑا تھا۔ جس وقت یہ مضمون شائع ہوا پورے شام میں اس پر شدید احتجاج کیا گیا اور اس پر ایک ہفتہ تک ہڑتال جاری رہی، مگر معقولیت کے ساتھ کوئی بات

ماننے اور تسلیم کرنے کی جگہ احتجاج کرنے والوں کو سختی سے دبانے کی بھرپور کوشش کی گئی، بڑے بڑے علماء کو گرفتار کیا گیا، احتجاج اور ہڑتال کرنے والوں کو پکڑا گیا، بہت سے لوگوں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں، اور الزام لگایا گیا کہ یہ سب استعمار کے ایجنٹ ہیں۔

یوں اس جنگ سے ایک روز پہلے تک شام کی مسلح افواج اپنے بھائیوں کو ہی تہس نہس کرنے میں سرگرم عمل تھیں۔ جس طرح مصر اپنی ساری طاقت اخوان کو کچلنے اور گرد و پیش کی عرب ریاستوں کو اپنے زیر اثر لانے اور یمن کو سرنگوں کرنے میں صرف کرتا رہا بالکل اسی طرح شام کی حکمراں پارٹی اپنی ساری قوت دینی عناصر کو دبانے اور اہلِ شام پر الحاد و اشتراکیت کو زبردستی مسلط کرنے میں کھپاتی رہی۔ اور روس اس اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں ملکوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا رہا۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ روس کی معاونت اور دستگیری اور اس کی براہِ راست نگرانی کے بغیر شام کی حکومت تو زندہ ہی نہیں رہ سکتی اور مصر بھی اپنے بل بوتے پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔

شام سے متصل دوسرا چھوٹا سا ملک اُردن ہے۔ اس ملک کے باشندوں میں اگرچہ جینے کا عزم اور حوصلہ موجود ہے اور وہ اپنے تحفظ کے لیے اپنی جانوں پر کھیلنا بھی جانتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے موجودہ جنگ میں ثابت کر دیا ہے، مگر شام اور مصر کی طرف سے اُس کے داخلی معاملات میں ایک مدت سے مسلسل مداخلت کی جاتی رہی، اس کے حکمران کو استعمار کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا اور حالیہ جنگ سے چند روز پہلے تک اس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ ان وجوہ سے یہ ملک سازشوں کا اڈہ بن گیا تھا اور اس کے سربراہ کی ہمت و جرأت کے باوجود اس کے وسائل کا زیادہ حصہ اس اندرونی خلفشار کی روک تھام میں صرف ہوتا رہا۔ حد یہ ہے کہ محاذ آزادیٔ فلسطین کے لیڈر احمد شقیری صاحب بھی فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کی بہ نسبت شاہ حسین کے اقتدار کا تختہ اُلٹنے کو مقدم سمجھتے رہے (باقی صفحہ ۵ پر)

بقیہ اشارات

اور ان کی بندوق کا رُخ یہودیوں کی طرف کہیں اُس وقت جا کر مڑا جب آغازِ جنگ سے چند روز پہلے شاہ حسین نے خود مصر پہنچ کر جمال عبدالناصر کے ساتھ دفاعی اتحاد کا معاہدہ کیا۔

سعودی عرب کے حالات اگرچہ دینی اعتبار سے مصر اور شام کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک کے فرمانروا دین کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے اس کا عشرِ عشیر بھی انہوں نے نہیں کیا۔ ان پر دین کا سب سے زیادہ حق تھا، کیونکہ سعودی خاندان کو دین ہی کی بدولت اقتدار نصیب ہوا۔ ان کو اللہ نے حرمین شریفین کی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ ان پر اس نے دولت کی وہ بارش کی جو کبھی ان کے اور کسی عرب کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ لیکن پچھلے ۲۰ سال کے دوران میں مغربی تہذیب ایک سیلاب اور طوفان کی طرح ان کی مملکت میں پھیلتی رہی اور اسے روکنے کے لیے کوئی مؤثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں۔ اس ملک کو دنیائے اسلام میں تقدس کا جو مقام حاصل ہے اس کی بنا پر وہ بڑی آسانی کے ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک رہنما قوت بن سکتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں اس نے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی وہ کوشش نہیں کی جو وہ فی الواقع کر سکتا تھا۔ ایک طرف مخلافی سازشوں اور رقابتوں کی وجہ سے مال اور وقت کا بڑا حصہ ضائع ہوتا رہا۔ دوسری طرف خدا کی دی ہوئی دولت کو بے دریغ عیش و عشرت اور شان و شوکت پر صرف کیا جاتا رہا۔ اور جو ذرائع و وسائل ملک کی معاشی اور فوجی طاقت کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال ہونے چاہییے تھے وہ اسراف و تبذیر کی نذر ہوتے رہے۔

اسی نمونے پر آس پاس کی ان چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کے شیوخ بھی چل پڑے جن کی زمین پے در پے تیل کی دولت اگلتی رہی۔ ان کی شاہ خرچیوں کی جو تفصیلات یورپ کے اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں، دشمن ان کا مذاق اڑاتے رہے ہیں اور مسلمانوں کی گردن شرم سے جھک جاتی رہی ہے۔

ان چیزوں کو پڑھ کر آدمی یہ سوچنا رہ جاتا ہے کہ اس قسم کی مُسرفانہ عادات کے ساتھ کیا کوئی قوم دنیا میں زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین میں تیل کے چشمے رواں کیے جن سے بے تحاشا دولت اُبل رہی ہے۔ مگر اس دولت سے اللہ کے دین کی آبیاری کرنے اور اپنی معاشی و فوجی طاقت بنانے کے بجائے اسے عیاشیوں میں بے دریغ بہایا جا رہا ہے۔ جس شیخ کا جب جی چاہتا ہے دو دو ہزار خدام اور خادماؤں کے ساتھ یورپ کا رُخ کر لیتا ہے اور وہاں ایک ایک دن میں لاکھوں روپے صرف ہوٹلوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان ممالک کی دولت کا بیشتر حصہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں خرچ ہوتا ہے اور وہاں کے دولتمند یہودی اسی مال کو پھر اسرائیل کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ بنک آف انگلینڈ کا تو استحکام ہی کویت کا رہینِ منت ہے۔

افسوس! جو ۲۰ سال کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عربوں کو دی تھی وہی اس نے اسرائیل کو بھی عطا کی تھی۔ اس مدت میں اسرائیل اپنی سیاسی، معاشی اور فوجی قوت بناتا چلا گیا۔ اور عرب اپنی قوتیں کچھ نفس پروری میں اور کچھ نمائشی کاموں میں، اور کچھ آپس کی کشمکش میں ضائع کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ ان کی بغل میں بیٹھا ہوا دشمن کیا تیاریاں کر رہا ہے، کتنی طاقت اس نے فراہم کر لی ہے، اور کیا اسباب ہیں جو اسے طاقتور بنا رہے ہیں۔

یہ تو ہیں ان ممالک کے دینی اور سیاسی حالات۔ جہاں تک ان کے فہم و بصیرت کا تعلق ہے اُس کے متعلق بھی کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہر ملک نکے کھلاڑی کی طرح خود نمائی کے جذبے میں سرشار اکیلا سکور کرنے کے درپے ہے۔ اُسے دنیائے اسلام یا دنیائے عرب کے مسائل سے زیادہ اپنی قیادت و سیادت قائم کرنے کی فکر دامنگیر رہتی ہے اور اس نشہ نے بعض ممالک میں جنوں کی سی کیفیت اختیار کر لی ہے۔ اس بنا پر وہ کوئی ایسی بات خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، سننے پر آمادہ نہیں ہوتے جس سے اُن کی قیادت اور برتری کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ اگر پوری دنیائے اسلام ایک صحیح بات پر متفق ہوتی نظر آتی ہو تو یہ اُس کی مخالفت کرنا اپنا فرض منصبی خیال کریں گے۔ ہم یہاں

اس کی ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

سعودی عرب کی طرف سے شاہ فیصل نے مسلمانوں کے اتحاد کی تحریک شروع کی اور اس سلسلے میں عرب اور مسلمان ریاستوں کو بعض ایسے مفید مشورے دیئے گئے جن سے سب کو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ اُن سے کہا گیا کہ مسئلۂ فلسطین کو صرف عربوں کا مسئلہ بنانے کے بجائے دنیائے اسلام کا مسئلہ بنایا جائے تاکہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ممالک کی تائید حاصل کی جاسکے۔ تمام مسلمان ممالک کے لیے اقتصادی لحاظ سے جامع منصوبہ بندی کی جائے اور باہمی تعاون سے ان سارے ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ پھر ثقافتی اور مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ لائحۂ عمل تیار کیا جائے اور مغربی تہذیب کی یلغار کو متحد ہو کر روکا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اس تحریک میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کسی مسلمان ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ مگر مصر اور شام دونوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور لوگوں کو یہ باور کرانے کے لیے پورا زور صرف کر دیا کہ یہ سب کچھ مغربی استعمار کے اشارے پر کیا جا رہا ہے اور یہ تحریک سامراجیوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے اٹھائی گئی ہے یعنیہ یہی پروپیگنڈا ماسکو سے بھی اتحاد عالم اسلامی کے خلاف کیا جا رہا تھا۔

پھر دیکھیے کہ تمام عرب ممالک ۱۹۶۵ء تک عرب سربراہوں کی کانفرنس کا کسی حد تک احترام کرتے رہے اور اس وجہ سے ان کا کچھ تھوڑا بہت بھرم قائم رہا۔ آخری کانفرنس ۱۹۶۵ء میں کاسابلنکا کے مقام پر ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسرائیل کے خلاف کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام عرب ممالک اپنے داخلی اختلافات ختم کر کے اور پوری طرح متحد ہو کر سرگرم عمل ہوں۔ لیکن اس فیصلے کے فوراً بعد ہی مصر اور شام کی طرف سے اسے ٹھکرایا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب اسرائیل نے اردن کی بستی السموع پر حملہ کیا تو تمام عرب ملکوں نے اس کی مذمت کی مگر انہیں یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ ایک جگہ سر جوڑ کر کوئی متفقہ راہ عمل اختیار کر سکیں۔

اسی کاسابلنکا کانفرنس کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جب اس میں کشمیر کے بارے میں

قرارداد منظور کی جانے لگی تو مصر نے شدید مخالفت کی۔ وہ تو بھلا ہو شاہ فیصل، عبدالسلام عارف مرحوم اور شاہ حسین کا کہ انہوں نے اس موقع پر بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیا اور اس قرارداد کو کسی نہ کسی طرح پاس کروالیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جمال عبدالناصر صاحب مسلمان ملکوں کے ساتھ یک طرفہ ٹریفک چلانا چاہتے ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو سب مسلمان ان کی مدد اور حمایت کریں مگر جب کسی مسلمان ملک پر مصیبت آئے تو وہ ان کے حق میں ایک کلمۂ خیر بھی نہ فرمائیں۔ اس سے بڑھ کر تدبر کا دیوالیہ پن اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسرائیل مشرق وسطیٰ کو ہڑپ کر جانے کے لیے زبردست تیاریاں کر رہا تھا اور وہ اسلحہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے علاوہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک کو اپنا موید بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا تھا۔ مگر مشرق وسطیٰ کے بدنصیب ممالک کا یہ حال تھا کہ عین اُس وقت بھی جبکہ جنگ کے شعلے ہر وقت بھڑکنے کے لیے تیار تھے، ان کی کوئی مشترکہ کانفرنس نہ کی گئی، ان کا کوئی متحدہ لائحۂ عمل نہ بنایا گیا، اور ان کی فوجوں کے درمیان تعاون و توافق کی کوئی صورت پیدا نہ کی گئی۔ مصر اور شام دوسروں کے تعاون سے بے نیاز ہو کر خود ہی اسرائیل کا مقابلہ کرنے کا دم واعیہ لیے بیٹھے رہے، اور دنیا کو یہ لاف زنی سناتے رہے کہ ہم چار گھنٹوں میں اسرائیل کا تیا پانچا کر کے رکھ دینگے۔ اُردن کے شریف اور وسیع الظرف فرمانروا نے خود مصر جا کر دستِ تعاون دراز کیا۔ سعودی عرب نے بھی خود آگے بڑھ کر امداد کی پیشکش کی۔ سوڈان، الجزائر، اور مراکش نے بھی خود اپنی فوجیں روانہ کیں۔ مگر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ عین آغاز جنگ کے وقت جہاں مختلف ممالک کی فوجیں یکایک اکٹھی ہو جائیں وہاں کوئی معرکہ آخر کیسے سر کیا جا سکتا ہے۔

دنیائے اسلام کا کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اس معاملے میں مشرق وسطیٰ کی پوری پوری حمایت نہ کی ہو۔ خصوصاً ترکی نے تو اس معاملے میں اسلامی اخوت کا بہت بڑا مظاہرہ کیا اور اپنی ساری تحفظات بھول کر عربوں کے موقف کی تائید کی۔ اسی طرح ایران نے بھی اس بات کو بھلا دیا کہ آغازِ جنگ تک اسے گالیاں دی جاتی رہی تھیں اور اس پر اسرائیل کی مدد کے الزامات لگائے جاتے رہے تھے۔ اسلامی اخوت کا لحاظ

کرکے اس نے یہ سب کچھ فراموش کر دیا اور عربوں کی کھلم کھلا حمایت کی۔ مگر اس شخص کی دانائی و ہوشمندی کی داد کس طرح دی جائے جس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کے دوست اور خیر خواہ اگر ہو سکتے ہیں تو مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ دوستوں کو ٹھکراتا رہا اور اس روس پر بھروسا کرتا رہا جس نے عین وقت پر دغا دیکر دکھا دی۔

ایک طرف نہ صرف عرب ممالک بلکہ پوری دنیائے اسلام امداد کے لیے بیتاب تھی مگر دوسری طرف یہ عالم تھا کہ کسی ایک جگہ مل بیٹھ کر صلاح مشورے کے لیے بھی آمادگی نہ پائی جاتی تھی اور اس مہم کو صرف روس کی امداد کے بھروسے پر سر کرنے کا ارادہ کیا جا رہا تھا۔ تمام مسلمان ممالک سے مشاورت تو خیر بڑی بات ہے کرنل ناصر صاحب کی انانیت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ صرف عرب ممالک ہی سے مشورہ کر کے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کر لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس پر اندھے اعتماد نے انہیں ہر دوسری قوت سے بالکل بے نیاز بنا دیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تنہا یہ معرکہ سر کر کے ہیرو بن جائیں۔ حد یہ ہے کہ لڑائی شروع ہو جانے کے بعد جب سارے ممالک نے از خود حق و انصاف اور اسلامی اخوت کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے سارے اختلافات ختم کر کے ناصر صاحب کی سربراہی میں اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ شروع کیا تو اس وقت بھی انہوں نے اُن کی کسی تجویز یا مشورے کو قبول نہ کیا۔ مراکش اس موقع پر بار بار یہ کہتا رہا کہ عرب سربراہوں کی کانفرنس بلا کر کوئی مشترکہ منصوبہ تیار کر لیا جائے مگر اُس کی بالکل شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر ۸ جون کو عرب وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس کویت میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر ظاہر ہے کہ یہ باتیں بعد از وقت تھیں۔

دورِ جدید میں جنگ کرنے اور پھر اُسے کامیابی کے ساتھ جیتنے کے لیے دوسرے تقاضوں کے علاوہ ایک نہایت ضروری تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ اپنے موقف کی صحت کے بارے میں پوری دنیا کو آگاہ کریں اور نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع استعمال کر کے دنیا کی رائے عام کو مطمئن کر دیں کہ آپ برسرِ حق ہیں اور آپ کا دشمن سراسر زیادتی کر رہا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ ضروری تھا

کہ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں تفصیل کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پر فلسطین کے اصل مسئلے کو پیش کیا جاتا۔ یورپ، امریکہ، ایشیا، افریقہ، غرض ہر براعظم کے عوام کو بتایا جاتا کہ ایک قوم کے وطن میں زبردستی دوسری قوم کا وطن پیدا کرکے کتنی بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ ناقابلِ انکار حقائق سامنے لاکر یہ ثابت کر دیا جاتا کہ اسرائیل کا وجود بجائے خود ایک ظلم اور جارحیت ہے جسے دفع کرنے میں عرب بالکل حق بجانب ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی عربوں کا پروپیگنڈا بہت کمزور رہا ہے اور یہودیوں نے اپنے پروپیگنڈا کے زور سے کم از کم غیر مسلم دنیا کی رائے عام کو اتنا متاثر کر لیا ہے کہ وہ ان ظالموں کو الٹا مظلوم، اور عرب مظلوموں کو الٹا ظالم سمجھنے لگی ہے۔ عرب صرف عربی زبان میں نشر و اشاعت کرکے یہ سمجھتے ہے کہ انہوں نے اپنا مقدمہ دنیا کے سامنے بخوبی رکھ دیا ہے۔ حالانکہ انگریزی، جرمن، فرنچ اور دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں ان کا پروپیگنڈا یہودی پروپیگنڈے کے مقابلے میں ایک فی صد بھی نہیں ہے۔

اس جنگ میں دنیائے اسلام نے بلاشبہ بہت کچھ کھویا ہے۔ غزہ اور جزیرہ نمائے سینا، دریائے اردن کے مغرب میں فلسطین کا وہ پورا علاقہ جو ۱۹۴۹ء میں بچا رہ گیا تھا، قدیم بیت المقدس اور بحیرۂ طبریہ کے مشرق اور شمال کا اچھا خاصا علاقہ یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ ہزارہا خاندان تباہ و برباد ہوئے۔ بے حساب ساز و سامان کا نقصان ہوا۔ اور نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیائے اسلام کے وقار اور ساکھ کو شدید صدمہ پہنچا۔ بے شک یہ ایک بڑا المناک سانحہ ہے لیکن اگر یہ ہولناک نتائج دنیائے اسلام کی آنکھیں کھولنے کا باعث بن سکیں تو پھر بھی ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑا۔ قوموں پر ایسے حادثات آتے ہی رہتے ہیں اور انہیں اس قسم کے نقصانات برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ شکست فتح کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اگر وہ اس سے عبرت حاصل کرکے اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کریں اور اپنے دوست اور دشمن کے درمیان تمیز کرکے اپنے معاملات کو سلیقے، صبر، عزم و ہمت اور اتحاد کے ساتھ طے کرنے کے ڈھنگ سیکھ سکیں۔

اوّلاً، اس بحران نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہوئے بغیر کوئی چارہ

نہیں۔ اسلامی اخوت کا رشتہ ہی سب سے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے سب رشتے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ ترکی، پاکستان، ایران، افغانستان اور دوسرے غیر عرب مسلمان ممالک نے جس طرح سے عربوں کا ساتھ دیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی اخوت میں اب بھی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ہمیں قوت و طاقت کے اس اتھاہ خزانے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دوسرے، اس جنگ نے اس حقیقت کو بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ کفر کے اپنے گھر میں خواہ کتنے شدید اختلافات ہوں، مگر اسلام اور مسلمانوں کی بربادی کے معاملے میں اُن کے اندر کامل اتفاق اور اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک پر بھی بھروسا کرنا بڑی ناعاقبت اندیشانہ روش ہے۔ مغربی الحاد اور اشتراکیت، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس خواہ آپس میں کتنے ہی دست و گریباں ہوں مگر اسلام کی مخالفت میں بالکل متفق اور متحد ہیں۔

تیسرے، مسلمانوں کے اندر نہ تو کوئی ایسی آئیڈیالوجی مقبول ہو سکتی ہے جو اسلام سے متصادم ہو اور نہ کوئی ایسا نظریہ پنپ سکتا ہے جو دین کی ضد ہو۔ جو دین ایک قوم کے رگ و پے میں سرایت کر کے اُس کی جڑیں نہایت گہری اتار چکا ہو اُسے محض قوت کے بل بوتے پر اکھاڑ پھینکنے کی کوشش بہت بڑی حماقت ہے۔ اسلام آج بھی اس ملت کی قوت و طاقت کا واحد سرچشمہ ہے۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو فکر و عمل کی کوتاہی کے باوجود اس پر اب بھی اعتقاد ہے۔ اس عظیم قوت کو نظر انداز کر کے باطل نظریات کو فروغ دینا بالکل پاگل پن ہے۔ چنانچہ اس وقت پوری دنیائے اسلام کی نجات اسی میں ہے کہ جس دین کے ساتھ وہ غیر شعوری محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اس کے ساتھ اُن کا شعوری اور ارادی تعلق پیدا کیا جائے اور اُس کے تقاضوں کے مطابق نہ صرف انہیں زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جائے بلکہ اس کے لیے انہیں مناسب ماحول اور سازگار فضا مہیا کی جائے۔

چوتھے، قدرتی وسائل کے اعتبار سے مسلمان قوم کوئی غریب اور مفلس قوم نہیں ہے کہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کیے بغیر اس کا زندہ رہنا ناممکن ہو۔ اس وقت کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے

قیمتی ذرائع وسائل دیئے ہیں۔ اس بنا پر اس کا فرض ہے کہ باری تعالیٰ کے ان عطیات کو اُس کے احکام کے مطابق استعمال کرے اور انہیں ایک مخصوص طبقہ کی میراث سمجھ کر اس کی عیش پرستیوں کے لیے انہیں مختص نہ کر دے۔

ان اصولی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف ممالک کے اندر ایسی قیادت کو اُبھارا جائے جو مسلمانوں کی ملّی امنگوں کی پوری طرح ترجمان ہو اور اس کے دینی تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتی ہو۔ غیر دینی نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے جو لوگ طاقت کے بل بوتے پر برسرِ اقتدار آجاتے ہیں وہ اس ملّت کی کوئی ٹھوس خدمت نہیں کر سکتے بلکہ قوم کی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کے بجائے انہیں باہمی سر پھٹول میں ضائع کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

مسلمانوں کو نشر و اشاعت کے لیے ایک مضبوط ملّی ادارے کے قیام کی بھی فکر کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے موقف سے دنیا کو صحیح طور پر آشنا نہیں کر سکتے۔

چراغِ راہ کا سوشلزم نمبر عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے۔ یہ نمبر جس کے لیے چوٹی کے ملکی اور غیر ملکی مفکّرین کا تحریری تعاون حاصل کیا گیا ہے، انشاء اللہ اپنے موضوع پر ایک یادگار دستاویز ہوگا اس نمبر کو پانچ حصّوں پر تقسیم کیا گیا ہے:

حصّہ اوّل:۔ اشتراکیت کا علمی مطالعہ۔ حصّہ دوم: اشتراکی تحریک۔

حصّہ سوم: اشتراکیت عمل کی تجربہ گاہ میں۔ حصّہ چہارم: بین الاقوامی جائزے۔

حصّہ پنجم: اشتراکیت اور اسلام۔ حصّہ ششم۔ اشتراکیت اور ادب

حصّہ ہفتم: اشتراکیت اپنوں اور دوسروں کی نظر میں حصّہ ہشتم: اشتراکی لٹریچر۔

حصّہ نہم:۔ مسائل کا حقیقی حل۔

مجوزہ ضخامت: ۵۰۰ صفحات۔ قیمت: ۶ روپیہ۔ سالانہ خریداروں کے لیے رعایتی قیمت: ۳ روپیہ۔